مخلصین اور دینی تحریکات کی طرف متوجہ اور دُعاگو رہے۔ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے رائے پور میں مستقل قیام نہ فرما سکے لیکن جب بھی وہاں تشریف لے گئے، خانقاہ کی رونقیں لوٹ آئیں، ذاکرین کا ہجوم ہو گیا اور اللہ کے ذکر سے فضا گونج اٹھی۔ رائے پور کے آخری سفروں میں تو خلقِ خُدا اُمنڈ پڑتی تھی، گرد و نواح اور دور دراز کے لوگ کھنچے آتے تھے۔ روزانہ کئی کئی ہزار لوگ بیعت ہوتے، غیر مسلم بھی بہت زیادہ تعداد میں زیارت کو آتے تھے۔

آپ تین چار سال سے صاحبِ فراش تھے۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ کھانا پینا اور دوسری ضروریات بھی اپنے ہاتھ سے پوری نہ ہوتی تھیں۔ پیشاب کے لئے بھی زیادہ تر نالی لگی رہتی تھی۔ کبھی بیماری کے حملے بالکل لاغر کر دیتے اور خدام مایوس ہونے لگتے، پھر وقت گزرنے کے ساتھ جسم میں قوت آنے لگ جاتی تھی۔ آخری سالوں میں مسلسل یہی کیفیت رہی۔ اتنی شدید تکالیف کا برسوں تک تحمل اور ایسا صبر کہ کبھی بھولے سے بھی زبانِ مبارک سے تکلیف کا اظہار نہ ہو یہ اللہ تعالےٰ کی رضا پر راضی ہونے کا وہ مقام ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے خاص مقربین کو عطاء فرمایا کرتے ہیں۔ آپ نے آخری رمضان شریف رائے پور میں گزارا۔ پاکستان سے بھی خدام کی ایک بڑی جماعت ساتھ رہی۔ واپسی کے چند روز بعد طبیعت خراب ہو گئی اور وہ وقتِ موعود آ ہی گیا جس کے تصور سے خدام کے دل دھڑک رہے تھے اور آپ کی روحِ مبارک لقاءِ الٰہی کے لئے اس وقت کی انتظار میں بے تاب تھی۔ ۳ جون کو عشاء کے وقت روحِ مبارک نے قفسِ عنصری سے پرواز کی۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی۔

۴ جون کو سرگودھا میں نمازِ جنازہ ہوئی۔ آپ کی عمر بھر کی آرزو کے مطابق آپ کے صاحبزادوں نے رائے پور میں تدفین کا فیصلہ کر لیا۔ جنازہ پڑھتے ہی لاہور کو روانگی ہو گئی۔ قانونی مراحل طے کرنے کے بعد آپ کو رائے پور لے جایا گیا۔ رائے پور میں جب جنازہ ہوا، رات کے ایک ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ عقیدت مندوں نے جنازہ میں شرکت کی اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے پہلو میں آپ کو آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ طریقت میں اب آپ کے مقام کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا آپ کے جانے سے یہ محفل ہی سُونی پڑ گئی ہے اور چاروں طرف اداسی چھائی ہے روحانیت کی ایسی متاع لٹی ہے جس کا بدل ملنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خانقاہی نظام کی بساط ہی

(بقیہ صـ۵۷ پر)

گوشۂ امیرِ شریعتؒ

مولوی محمد سعید مرحوم
ایڈیٹر پاکستان ٹائمز لاہور

ترتیب و تلخیص
محمد عمر فاروق

شاہ جی اور قافلہ احرار

مولوی محمد سعید مرحوم پاکستان کی انگریزی صحافت کے معمار بزرگوں میں سے تھے۔ ڈان، پاکستان ٹائمز، ٹائمز آف کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کام کیا۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ مرحوم اردو کے صاحبِ اسلوب نثر نگار تھے۔ ۱۹۹۱ میں بعمر اسّی سال وفات پائی۔ زیر نظر مضمون ان کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "آہنگ بازگشت" سے لیا گیا ہے۔

انگریز جب آزادیٔ مذہب کی آڑ میں ---------- غیر جانبدار ہو گیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں اور ریفارمروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر نجاست اُچھالنے کو پیشہ بنا لیا۔ بہرکیف دلی میں عبدالرشید کے ہاتھوں شردھانند کیفرِ کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں شاتمانِ رسولؐ کے اس انجام نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمان قوم نے اپنے غیظ و غضب کے اظہار میں کسی مداہنت کو روا نہیں رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسہ میں برملا کہہ دیا: "اللہ سے گستاخی کرنے والوں سے تو وُہ خود نپٹ لے گا۔ لیکن رسولؐ کی طرف اُٹھنے والی اُنگلی کو ہی نہیں، شانے سے بازو تک کو کاٹ دیا جائیگا۔"

یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ خلافت ایجی ٹیشن کا اتحاد و اتفاق ہندو مسلم فسادات کے خونیں سلسلے کی نذر ہو گیا۔ اور آزادی کی قرارداد پاس ہوتے ہی شاتمانِ رسولؐ کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی۔ صاف عیاں ہو چکا تھا کہ یا آزادی کا خواب پریشان کیا جا رہا ہے یا آنے والے دَور کی ایک دُھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔

بہرکیف کچھ عوامل ضرور ایسے کارفرما تھے، خواہ وہ نفسیاتی ہوں یا سیاسی، جو دو قوموں کے اتحاد کے درمیان متواتر حائل ہو رہے تھے۔

ہندو ڈوگروں کے غرور کی انتہا بالآخر قرآنِ پاک کی توہین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ کشمیری کہ جنہوں نے بے چارگی میں برسوں اپنے بچوں کے گلگوں چہروں پر طمانچے پڑتے دیکھے تھے۔ اس سانحہ پر اُن کے ہاتھ سے بھی دامنِ صبر چھوٹ گیا۔ وُہ اُٹھے اور ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے روز اپنے جابر حکمران کے ساتھ ٹکرا گئے۔ یہ تاریخی تصادم امیرا کدل پر ہُوا۔ حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ کشمیریوں نے ڈوگرے سپاہیوں سے بندوقیں چھین چھین کر دریا میں پھینک دیں۔ پشاور کے بعد سری نگر شمالی ہندوستان کا دُوسرا شہر تھا جو اُن دِنوں مُسلمانوں کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

وادیٔ کشمیر میں جو جنگ ڈوگروں کے خلاف جاری ہو چکی تھی۔ اُس کی بازگشت پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہُوئے پنجاب کے ہر قریہ اور ہر شہر میں ہوئی۔ احرار کے ابتدائی ایام تھے۔ احرار کی بے پناہ خطابت کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کوئی موضُوع مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے پنجاب کے طول و عرض میں اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا دی۔ سُرخپوش ابھی تک قصہ خوانی کے معرکہ خونین سے پُوری طرح نہ اُبھر سکے تھے۔ خاکسار تحریک کے خطوط ابھی تک غیر مرئی تھے۔ لیگ اپنی مجبوریوں اور کانگرس اپنی مصلحتوں کی بناء پر اس تحریک میں اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کشمیر کمیٹی مشن کی قیادت چنانچہ احرار کے ہاتھ میں آگئی۔ اور وُہ اُس کے لئے موزوں تھے۔ مسئلہ مُسلمانوں کی آزادی اور اُن کے مذہبی تحفظ کا تھا۔ انھیں دو اجزاء سے احرار کی حکمتِ عملی نے ترکیب پائی تھی۔ قید و بند سے وُہ خائف نہیں تھے۔ اُنکی قیادت نے اگست ۱۹۳۱ء میں تیس ہزار آدمیوں کو ڈوگروں کی جیلوں اور کیمپوں میں بھیج دیا۔ سیالکوٹ شہر کا کوئی جوان ایسا نہ ہوگا جس نے سچیت گڑھ کے کیمپ کے خاردار تاروں کے پیچھے چند دِن نہ گزارے ہوں۔ قافلے جب ظفر علی خان کا نغمہ "کشمیر چلو۔ کشمیر چلو" گاتے ہُوئے نکلتے تو منظر دیدنی ہوتا۔ بیویاں خاوندوں کو اور مائیں بچوں کو بڑی دعاؤں اور ولولوں کے ساتھ رُخصت کرتیں۔

پنجاب کے ہندو پریس نے حسبِ معمول اس مسئلے کو اُسی نگاہ سے دیکھا جس سے وہ ہر مسئلے کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اُنھوں نے یہ نہ دیکھا کہ ایک خطّے کے لوگ وہاں کے جابر حکمرانوں کے پنجۂ استبداد کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے مہاراجے کے نام کی رعائیت سے اسے بھی ہندو مُسلم مسئلہ بنا دیا۔ چنانچہ آریہ سماجی پرچارک جگہ جگہ پھیل گئے۔ مسلمان والیانِ ریاست کے ظلم و جور

کے ایسے ایسے افسانے گھڑے گئے کہ تاریخ انگشت بدنداں رہ گئی۔

ان دنوں احرار کا ستارہ بڑے عروج پر تھا۔ پورا پنجاب اُن کی مٹھی میں تھا۔ عوام سے اُستوار رابطہ یونینسٹ پارٹی اور اُس کے ارباب بندوبست کے لئے سوہانِ رُوح ثابت ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اگلے چند برسوں میں یونینسٹ پنجاب کی سرزمین پر سر فضل حسین کی قیادت میں بلا شرکت غیرے اپنا پھریرا لہرانا چاہتے تھے۔ احرار تو ان کے نزدیک خیر کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔ وُہ لیگ تک کو اپنی قلمرو میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ مجلس احرار وہ پہلی جماعت تھی جو پنجاب کے جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کے لئے بے اطمینانی کا باعث تھی اور جس کا رابطہ براہِ راست عامۃ الناس سے تھا۔ بہرکیف دونوں اُبھرتی ہُوئی قوتوں میں ٹھن گئی۔ احرار کہ ہو متمرّد راجواڑے کو سرنگوں کر چکے تھے اور یونینسٹ کہ جن کی پشت پر انگریز کا دبدبہ اور سر فضل حُسین کی زیرکی تھی۔ تحریک کشمیر کے دوران ہی اس تناؤ کے آثار ہویدا ہو چکے تھے۔ ہری سنگھ ڈوگرے کی تذلیل کے بعد اُنھوں نے اپنا رُخ سر فضل حُسین کی جانب کر لیا۔

لائلپور کے دھوبی گھاٹ میں ان کا اجتماع ایسا فقید المثال تھا کہ چاروں طرف احرار کی قوت کی دھوم مچ گئی۔ احرار نے لائلپور سے فارغ ہو کر پسرور میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب اینٹوں کے ایک ویران بھٹے کے پاس کھلے میدان میں اُن کا پنڈال نصب ہُوا۔ آبادی کے لحاظ سے پسرور کا جلسہ بھی کچھ کم کامیاب نہیں تھا۔ جلسے کے دوران مجھے ایک دوست چودھری علی محمد باجوہ نے جو لاہور سے آئے تھے بتایا کہ مسجد شہید گنج کا تنازعہ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور لاہوری مسلمانوں کی یورش محلّہ دارا شکوہ پر برابر ہو رہی ہے۔

۹ جولائی ۱۹۳۵ء کا دن شہید گنج کے پرستاروں کے لیئے قیامت کا دن تھا۔ لاہور کے دلّی دروازہ کے باہر محلہ دارا شکوہ پر مسلمانوں کی یورش ہو رہی تھی۔ ناکہ خار دار تاروں سے بند تھا۔ کوتوالی کی برجیوں پر گورا فوج ہتھیار نصب کئے بیٹھی تھی۔ جوانانِ لاہور چھاتیاں کھولے موجوں کی صورت میں آگے بڑھتے جاتے اور موت کے گھاٹ اُترتے جاتے۔ یہ خبر مجھے احرار کے جلسہ میں ملی۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقت میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن

لدھیانوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیسٹر کی سرکلر روڈ پر کاشانہ میں اُن کا قیام تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میں نے سلام عرض کیا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا کہ

"لاہور میں جو گولی چل رہی ہے اُس کی ذمہ داری کس پر ہے؟" سید صاحب کچھ کہہ نہیں پائے تھے کہ مولانا لدھیانوی نے گرج کے کہا: "جاؤ۔ کرم آباد، ظفر علی خان سے پوچھو۔" پیشتر اس سے کہ میں کچھ اور عرض کرنے کی جسارت کرتا۔ شاہ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔ بڑی شفقت سے خیر و عافیت پوچھی۔ میرے جذبے کو سراہا۔ اور پھر کسی قدر جوش میں آ کے پوچھا:

"اگر پنجاب میں خانہ جنگی چھڑ گئی تو تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگے: "آج ہی لاہور جا کے عورتوں کے برقعے اُتروا سکتا ہوں لیکن اگر پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

پچھلے پہر مولانا حبیب الرحمٰن کو جلسہ میں تقریر کرنا تھی۔ تقریر کے دوران اُنھوں نے احرار کو اُلجھانے کے جو منصوبے بن رہے تھے اُن کا ذکر کیا اور کہا کہ

"میں ایسا نااہل جرنیل نہیں ہوں کہ جو فوج کو دشمن سے لڑا کے فنا کر دے۔"

شہید گنج کا قضیہ طول کھینچ گیا اور مسجد تھوڑے سے رد و بدل کے بعد گوردوارے میں بدل دی گئی۔ واقعات کی رو میں نہ صرف احرار ہی کچلے گئے بلکہ مولانا ظفر علی خان بھی نہ اُبھر سکے۔ ظفر علی خان اور احرار کے درمیان بڑے بڑے قلمی اور زبانی مجادلے ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک دوسرے کے مجمعوں کو منتشر کرنے کی ایسی ترکیبیں سوچی جاتیں کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ سیالکوٹ میں مولا بخش کے تالاب کو خشک کرکے وہاں احرار نے اپنا کنونشن جمایا۔ سیالکوٹ احرار کا ناقابلِ تسخیر حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ کنونشن اپنے رکھ رکھاؤ اور تزک و احتشام کے اعتبار سے بڑے برتن کی بڑی کھرچن ثابت ہوا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقریر کر رہے تھے کہ جلسہ گاہ کے ایک کونے سے ظفر علی خان زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ دو چار آوازیں اور شامل ہو گئیں، مولانا جلال میں آ گئے اور پکارے: "والنٹیرز

نکال دو ان مرزائیوں کو۔ ظفر علی خان بہادر ہے ہم اُس کے وارث ہیں ہم بہادر ہیں ظفر علی خان ہمارا وارث ہے۔ بہادروں کی محفل میں ان بزدلوں کا کیا کام؟" نعرہ باز ہاتھوں ہاتھ دروازے تک اور پھر سڑک تک پہنچا دیئے گئے۔ اور جلسہ جاری رہا۔

جلسے کے ایک اجتماع کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ تلاوتِ قرآن پاک ہو رہی تھی کہ مولانا حبیب الرحمن اپنے خیمے سے برآمد ہو کر جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اُن کے آگے آگے بینڈ مارچنگ کی دھن بجا رہے تھے۔ اور نعرے لگ رہے تھے۔ آوازیں ہمیں جلسہ گاہ میں برابر آ رہی تھیں۔

مولانا مظہر علی اظہر کی تقریر بڑی معرکہ آرا تھی۔ ایک مقام پر انھوں نے انگریز حکمرانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "مسلمانوں کے جذبات سے مزید کھیلنا بغاوت کو دعوت دینا ہے۔"

اس جملے پر شاہ صاحب کرسیٔ صدارت سے اُٹھ کر فرطِ جوش سے اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔

مولا بخش کے تالاب کا جلسہ احرار کا دمِ واپسیں تھا۔

جس شخص کو لاہور کا وہ دور دیکھنا نصیب ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جو قوم دولتیوں سے عافیت کوش اور مصلحت اندیش ہو چکی تھی۔ اُس کی اگلی نسل کی تربیت کہاں ہو رہی تھی۔ ان شکستہ دیواروں سے عطاء اللہ شاہ بخاری کی للکاریں ٹکرا چکی ہیں۔ موچی دروازے نے اقبال کا جواب شکوہ سُنا۔ دلی دروازے نے ظفر علی خان کے نغمے اور نعتیں سُنی ہیں۔

جلسے جس اہتمام سے جمائے جاتے اُسی اہتمام سے برہم بھی کئے جاتے۔ اِس دور میں تو گولی اور بم نے جلسوں کے اُجڑنے کا سارا لُطف غارت کر دیا ہے۔ اُن دنوں جمے جمائے جلسے محض پھبتیوں کے زور سے ہوا میں اُڑا دیئے جاتے۔ شروع شروع میں تو جلسہ گاہ کے گوشوں پر بُرے سیچے سُروں میں پھبتیوں۔ ضلع جگتوں۔ طعنوں اور نعروں کی گونج سُنائی دیتی۔ کچھ دیر تک تو زُمرہ ور کی تیز دستی اُنھیں دبائے رکھتی۔ پھر آواز اسٹیج کی جانب قدم بقدم بڑھتی سُنائی دیتی تا آنکہ والنٹیر کود جانے اور پھر یک لخت دست بدستے دگرے کا سماں پیدا ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد کوئی ٹوٹی ہوئی طناب یا کسی نقش پا کی شوخی کہے دیتی کہ ابھی کوئی اِس راہ سے گزرا ہے۔

لاہوریوں کو ایک مرتبہ ایسے ہی موڈ میں پا کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے للکار کے کہا: "دُہی دتی

دروازہ ہے۔ وہی پیپل کا پیڑ۔ برس دن کے بعد لَوٹ کے آیا ہوں۔ پھر برسا لو پتھر۔ خُدا کی قسم تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ عبداللہ کے یتیم بیٹے ؐ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ آخری جُملے نے پُوری محفل کو بیخود کر دیا تھا۔ میرے قریب گھاس پر ہی لاہوری جماعت کے مولوی صدرالدین بیٹھے تھے وُہ ہڑبڑا کے پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور اُنکے مُنہ سے اللہ اللہ اس طرح بے ساختہ نکلا کہ جیسے بجلی کی کڑک نے اُنھیں نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

آج جب کبھی دِلّی دروازے سے گزرتا ہُوں اور اُس اُداس اور کہنہ سال پیپل کو دیکھتا ہُوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہہ رہا ہو:

سنگ در دیوارہا از شوخیٔ طفلاں نماند
شہر گر ویراں شود، خُود را بصحرا میکشم

(بچوں کی شوخیوں نے کوئی پتھر دیواروں میں نہیں چھوڑا اور اگر شہر یوں ویران ہو گیا تو میں صحرا کو چل دوں گا)

علیگڈھ کی مرکزی حیثیت کا اندازہ اُس ایک جُملے سے ہوتا ہے جو سیّد عطاءاللہ شاہ بُخاری نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر شروع کرنے سے قبل کہا۔ کہ جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علیگڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پُورے ہندوستان کے مُسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔

علیگڑھ لفنٹوں کے اندر تغیر لانے کا اہتمام تھا۔ علیگڈھ نے اگرچہ ابتدا ہی سے بڑے سیاسی معرکے دیکھے تھے اور خود اس کا اپنا وجُود ایک سیاسی اقدام تھا لیکن جس دَور میں سے یہ اس صدی کے چوتھے عشرے میں گزر رہا تھا وُہ بڑا فیصلہ کُن تھا

اس عرصے میں علیگڈھ میں چار عظیم ہستیاں آئیں۔ حکمرانوں کے جذبات کے ترجمان لارڈ لوتھین کہ جن کے بارے میں عام تأثر تھا کہ وُہ وائسرائے بن کر آ رہے ہیں۔ کانگرس کے ذہن کی ترجمان مسز سروجنی نائیڈو، مسلمان وطن پرستوں کے نمائندہ سیّد عطاءاللہ شاہ بُخاری۔ اور مُسلمانوں کے اُبھرتے ہُوئے سوادِ اعظم کے نمائندہ قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ یہ مشاہیر اپنے اپنے رنگ میں فقید المثال تھے۔

سروجنی نائیڈو شاعرہ تھیں۔ اپنے ہمعصر لوگوں میں وُہ قائد کی بے حد مداح تھیں ثقافت اُنھیں مسلمانوں کی مرغوب تھی۔ اور سیاست گاندھی جی کی۔ بہادر یار جنگ کی خطابت کی دلدادہ تھیں۔ اور خُود بھی سحر بیان مقررّہ تھیں۔

قائدِ اعظم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بن کے اُبھرے۔ منطق اُن کی تیغ بستہ ہوتی اور خطابت شعلہ فشاں، دلائل پر جائیے تو مفر نہیں تھا۔ خطابت پر جائیے توڑ کنا محال ہوتا۔

عطاءُ اللہ شاہ بُخاری، خُوبرو۔ خوش گلو۔ خطابت کی ہر رمز کے شناسا۔ اسٹیج پہ آتے تو آنکھوں کو بھلے لگتے۔ بولتے تو فردوس گوش اور تقریر جیسے جیسے بڑھتی دماغ دل کے حق میں دست بردار ہو جاتا اور دِل شاہ صاحب کی انگلیوں میں ہوتا۔ شاہ صاحب نے یونین ہال میں ایک معرکہ آراء تقریر میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی تفسیر بیان کی۔ یُونین کے صدر کو گمان گزرا کہ تقریر شائد فرقہ وارانہ ہو جائے گی۔ چنانچہ اُنھوں نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ فرقہ وارانہ تقریر یونین کے قواعد کی رُو سے ممنوع ہیں۔ شاہ صاحب نے اطمینان دلایا کہ یُونین کی ہر روایت کی پاسداری کی جائے گی۔

تقریر شروع ہُوئی اس حال میں کہ اسٹیج پہ دیگر حضرات کے علاوہ رشید احمد صدیقی جیسے بذلہ سنج اور شُستہ مذاق اور ہادی حسن جیسے سحر بیان بیٹھے ہُوئے تھے۔ شاہ صاحب جب ظرافت پر آتے تو رشید احمد ہنسی ضبط نہ کر سکتے اور جب خطابت کی بلندیوں کو چھُوتے تو ہادی حسن جھُوم جھُوم جاتے۔ اُن کی تقریر کا نقطۂ عروج وہ سین تھا جب اُنھوں نے اپنے رُومال کی جھولی بنا کے آگے بیٹھے ہُوئے بچوں سے کہا کہ آؤ بچو مٹھائی لیتے جاؤ۔ ایک ایک بچہ آگے بڑھتا، شاہ صاحب اُسکی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ جب آخری بچہ آیا تو اُس کی جھولی میں سب کچھ اُلٹ دیا اور جب اس کے بعد بھی ایک بچہ اچانک اُٹھ بیٹھا تو شاہ صاحب نے اپنا خالی رُومال ہوا میں لہرا کے وجد آفرین قرأت میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا اعلان کر دیا۔ یہ آیت اس سوز اور حمیت سے پڑھی کہ پُورا ہال تحسین کے نعروں سے گُونج اُٹھا۔ اقبال کے مصرعہ "داد مارا آخریں جامے کہ داشت" کو یُوں حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے ہُوئے آنکھوں نے اُس روز دیکھا۔ شاہ صاحب کو زبان پر جو عبُور

حاصل تھا اس پر انھوں نے اپنے فخر کا دلی اور لکھنؤ والوں کو خطاب کر کے اظہار یہ کہہ کر کہ "برس دن کے بعد اردو میں تقریر کر رہا ہوں۔ کہیں زبان کی غلطی کر جاؤں تو ٹوک دینا۔"

میں تقریر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں شاہ صاحب کی ایک اور ہی تصویر ابھر رہی تھی۔ چونڈے کا دیہاتی اسٹیج ہے، ان پڑھ لوگوں کا ہجوم ہے۔ شاہ صاحب پنجابی میں تقریر کر رہے ہیں اور ان سادہ ورق لوگوں کے دلوں کو گرماتے جا رہے ہیں۔ یا پھر گلو شاہ کے میلے میں منبر بچھا ہوا ہے اور وہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور لوگ سر دھن رہے ہیں۔ اسٹیج علیگڈھ کا ہو یا موچی دروازے کا منبر جامع مسجد دہلی کا ہو یا گلو شاہ کا۔ شاہ صاحب کا جادو یکساں ایمان افروز ہوتا۔

قافلۂ احرار کہ جو گزشتہ پندرہ برسوں میں بڑے جانگداز نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ اب اس مقام پر پہنچ گیا کہ کانگریس اُن کے اپنے نزدیک اب ایک فاشسٹ جماعت ہو چکی تھی۔ چنانچہ نبیرزادہ نصراللہ خان نے کہ جو ان دنوں احرار کے قافلہ سالار تھے۔ ایک بیان جاری کیا کہ چونکہ کانگرس کے ہاتھوں ملک کا امن تباہ و برباد ہو گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اپنی سیاسی سمت پر نگاہ ثانی کی جائے۔ اور اب وہ پالیسی اختیار کی جائے جو مسلمانوں کی امنگوں کی ترجمان ہو۔" احرار نے بہار اور نواکھلی کے فسادات کی مذمت کی اور اپنی سعی کو کاملاً "ہندی مسلمانوں کی رستگاری" کے لئے وقف کر دیا۔

احرار کی سیاست اگرچہ بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ تاہم وہ ایک بات میں بڑے ثابت قدم رہے اور وہ انکی قادیان دشمنی تھی۔ انھیں جس شہر اور جس اسٹیج سے موقعہ ملا انھوں نے اس دشمنی کا اظہار بھرپور انداز میں کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ایسا دکھائی دیا کہ سیاسی اسٹیج پر سے ہمیشہ کے لئے اتر گئے ہیں۔

ایک رات[1] دفتر میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ معلوم ہوا سید عطاء اللہ شاہ بخاری آرام باغ میں تقریر کرنے والے ہیں۔ اخبار کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دوسروں کے سپرد کر کے آرام باغ چلا گیا۔ شاہ صاحب کو سنے ہوئے مدت ہوئی تھی اور پاکستان بننے کے بعد سے انھیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

---

[1] دفتر روزنامہ "ڈان" کراچی